© rasailojaraid.com

مولانا عبدالماجد دریابادی

تفسیر قرآن مجید کے جدید تقاضے

[مقالہ جو بمبئی میں حاجی صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ۳۰ر اپریل ۱۹۷۲ء کو سنایا گیا۔]

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیته و یزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة. (الجمعة: ۲)

[اللہ وہی ہے جس نے مکہ والوں کے درمیان انہیں میں سے ایک پیمبر اُٹھایا، جو اُن کو آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن کو پاک صاف کرتے ہیں اور انہیں کتابِ الٰہی اور دانائی کی تعلیم دیتے ہیں۔]

گویا پیمبر کا کام تلاوت آیات اور نفس وقلب کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ کتابِ الٰہی کی تعلیم دینا بھی ہے۔ اور اس تعلیم کی ضرورت جب اہلِ عرب اور اہلِ مکہ کو تھی، تو ہندوستان اور پاکستان، ترکی اور افغانستان کے لیے تو اور زیادہ ہی ہوگی، جن کی زبانیں عربی سے الگ اور بالکل مختلف ہیں۔ اور ''تعلیم'' کے اندر تشریح وتبیین کا پورا ہی مفہوم آ گیا۔ محض لفظی ترجمہ نہیں۔ عقیدے، احکام، عبادتیں، حکایتیں جو کچھ بھی قرآن کے اندر بیان ہوا ہے، اس سب پر بھرپور حاشیہ بڑھانا چاہیے۔ اور ہر اجمال کی تفصیل، زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک اپنانا چاہیے۔

صحابیوں نے سوالات شروع کر دیئے اور تاویل وتفسیر کا مستقل فن وجود میں آنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگا۔ ابتدائی بنیادیں اسی وقت سے اس فن کی پڑنے لگیں۔ اور تفسیروں کے مختصر مجموعے صحابہ کی زبان سے پہلی ہی صدی میں مرتب ہونے لگے، یہاں تک کہ تیسری صدی سے مستقل تفسیریں قرآن کی، پہلے مختصر اور بعد کو خاصی ضخیم و جامع وجود میں آنے لگیں۔ یہ تاریخ تفسیر بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے، مگر یہاں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ ہر مفسر نے قرآن کی ترجمانی اپنے دَور اور اپنے ماحول کے مطابق ہی کی ہے اور شرح میں پورا لحاظ اپنے مخاطبین کے فہم اور ذوقِ استعداد کا رکھا ہے۔ مثالی اور بہترین تفسیروں میں امام رازی کی مشہور و معروف تفسیر کبیر ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ چھٹی صدی ہجری اور ساتویں صدی ہجری کے بالکل شروع کا ہے۔ فلسفۂ یونان دُنیا پر اس وقت اسی طرح چھایا ہوا تھا جیسا کہ آج یورپ کی سائنس ہے۔ تفسیر میں رازیؒ نے پوری اور کامیاب ترجمانی اس کی کی ہے کہ ہر مضمون کو یونانیوں کے نقطۂ نظر سے آراستہ و مدلل کر کے دکھا دیں، بیسویں صدی عیسوی میں دُنیا کا جو علمی نقطۂ نظر بالکل دوسرا ہو کر رہ گیا ہے، اس سے قدیم مفسرین کو کوئی سابقہ ہی نہیں پڑا اور نہ اُن کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہو سکا کہ اب قرآنیات کے طلبہ وقت کے علمی نظریات سے متعلق اپنی تشفی چاہیں گے اور فلاں فلاں سوالوں کے جوابات کی تلاش و جستجو جغرافیہ اور تاریخ، اثریات وغیرہ میں کریں گے، لے دے کے ایک عراقی بزرگ فاضل اجل علامہ محمود آلوسی بغدادی انیسویں صدی کے وسط میں ایسے ہوئے، جنہوں نے اپنی ضخیم تفسیر روح المعانی میں جدید فلکیاتی بحثوں پر توجہ کی ہے۔ اور کرویت و حرکت ارض وغیرہ کو بحث میں لائے، عالمِ اسلامی نے ان کی قدر کی اور علمائے امت کے درمیان ان کی تحقیق کو حسنِ قبول حاصل ہوا۔ لیکن علامہ موصوف کو بھی اب خاصہ وقت گزر گیا، اُن کی وفات سنہ ۱۸۵۴ عیسوی میں ہوئی اور اُن کی تفسیر اس سے چند سال قبل یعنی ۱۸۴۵ء-۱۸۴۶ء کی ہے۔ لیکن علوم جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں، اس کے لحاظ سے یہ تفسیر بھی سوا سو برس کا زمانہ گزر چکنے کے بعد خاصی باسی ہو چکی ہے اور اس کی جدیدیت، قدامت میں بدل چکی ہے۔ تاریخِ تفسیر میں یہ دو بڑی روشن گراں بہا مثالیں پیشِ نظر رکھ کر اور ان دو ہستیوں سے ہمت اور ڈھارس کا سبق حاصل کر کے اس بے علم کے نزدیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب جدید مفسر کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ مضامینِ قرآنی کا جائزہ ذیل کے گوشوں اور پہلوؤں سے لے اور کتابِ الٰہی کی ترجمانی آج کی زبان یعنی بیسویں صدی عیسوی کی نصف بلکہ ثلث، آخر کی زبان میں کرے:

(۱)

سب سے پہلے توجہ تاریخی پہلو پر رکھیے اور قرآن مجید نے جو بہ کثرت مثالیں دوسری قوموں اور تاریخی شخصیتوں کی خیر و شر دونوں موقعوں پر پیش کی ہیں، ان کے اثر اور ان کے استناد کو ہرگز ضائع یا کمزور نہ ہونے دیجیے۔

فرعون کا لفظ قرآن میں کس کثرت سے آیا ہے۔ اس پر یہ کہہ کر نہ گزر جائیے کہ یہ نام مصر کے ایک قبطی بادشاہ کا ہوا ہے، جو کسی نامعلوم زمانہ میں تھا۔ تاریخ و اثریات (آرکیالوجی) دونوں کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیے اور اپنے ناظرین کو پہنچائیے، کہ یہ کسی فردِ واحد کا شخصی نام یا لقب نہ تھا، بلکہ ایک قبطی شاہی خاندان کے تاجدار کا سرکاری لقب تھا۔ جیسے رومہ کے بادشاہ قیصر کہلاتے تھے، جاپان کے میکاڈو۔ فرعون لقب کے بادشاہ مصر قدیم میں بہت سے ہوئے ہیں، جن کے شخصی نام الگ الگ تھے، اور یہ لقب اس بنا پر ہوتا تھا کہ مصریوں کے عقیدے میں بادشاہ 'اوتار' ہوتا تھا اور سب سے بڑے دیوتا، یعنی سورج دیوتا کا (جسے مصری زبان میں رع کہتے تھے) اوتار ہوتا تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ کے ہم عصر دو فرعون ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلے کے زمانہ میں ستم رانیوں کی شدت شروع ہوئی تھی اور انجام اس کے جانشین کے وقت نکلا کہ اسرائیلیوں کو مصر سے ہجرت کرنا پڑی اور فرعون کو ان کے ناکام تعاقب میں غرقابی حاصل ہوئی اور یہ واقعہ تقریباً وتخمیناً ۱۴۴۰ قبل مسیح کا ہے۔

پیمبروں میں قریب ترین عہد حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ہوا ہے۔ ان کے واقعات و حالات کئی پہلوؤں سے کہیں زیادہ منکشف ہو چکے ہیں اور کتبے اور نوشتے ہیں کہ برابر نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سے ان کی تعلیمات پر بھی مزید روشنی پڑ رہی ہے، ان انکشافات سے ان کی جانچ پڑتال کے بعد پورا فائدہ اُٹھائیے اور اس لیے ہرگز نہ جھنجھئے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے بڑوں کے اقوال سے مختلف پڑ رہی ہیں۔

قدیم پیمبروں حضرت یونسؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ، یہاں تک کہ قدیم ترین انبیاء حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے حالات اب اس درجہ تاریکی میں نہیں رہے ہیں جیسے چند صدی قبل تھا۔ مفسرین قدیم کے اقوال و روایات کو کلام اللہ نہ سمجھئے۔ کلام الناس کو وہ مرتبہ نہ دیجیے اور خود کلام اللہ میں بھی اس کی اعجازی لچک کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھئے۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد کے واقعات بہت سے علم میں آ چکے ہیں اور بہت پر سے ابھی پردہ اُٹھنا باقی ہے، آپ کے بحری جہازوں اور کشتیوں کی آمد و رفت تاریخ سے ثابت ہے۔ البتہ آپ کے ہوائی سفروں کی شہادت تاریخ سے نکلنا باقی ہے، اس وقت تک قرآن مجید کی تصدیق کے لیے آپ کا بحری سفر بھی کافی ہے۔ قرآن مجید میں صراحت آپ کے ہوائی سفر کی موجود نہیں۔ قرآن نے دعویٰ صرف یہ کیا ہے کہ آپ کو ہوا پر بھی قدرت دی گئی تھی۔ بات اس سے آپ کے ہوائی سفر کی بھی نکل آتی ہے، اس وقت تک زور صرف آپ کے بادبانی جہازوں کے سفر پر دیجیے۔ تسخیر ہوا کی اہمیت کے لیے بادبانی جہازوں کے سفر بھی کسی درجہ میں کافی ہیں۔

حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں آپ کی مصلوبیت کی بحث بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں صراحت صرف اس کی ہے کہ آپ کو نہ تو شہید کیا گیا اور نہ سولی پر چڑھایا گیا (**و ما قتلوہ وما صلبوہ**) البتہ آپ کے دشمنوں کو آپ کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا گیا۔ (**و لکن شبہ لھم**) قرآن کے اس اجمال کی تفصیل تاریخ کے صفحات میں ڈھونڈئیے۔ محض کسی بزرگ کے قیاسی بیان یا گمان پر نہ رہئے۔ حضرت مسیح کا زمانہ آج سے دو ہزار قبل کا، کھلا ہوا تاریخی زمانہ ہے۔ رومی و اسرائیلی دونوں تاریخیں اس عہد کی موجود ہیں۔ آپ کا ملک فلسطین تھا اور فلسطین پر حکومت اس وقت رومیوں کی تھی جو عقیدتاً مشرک تھے اور فلسطین انہیں کے ماتحت ایک نیم آزاد صوبہ تھا اور عام آبادی وہاں اسرائیلیوں کی تھی۔ اسرائیلی پیشوا و مقتدا آپ سے خاص طور پر جلے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے آپ کو حسبِ قاعدہ گرفتار کر کے پہلے مقدمہ اپنے ہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اعلیٰ مذہبی عدالت میں چلایا اور سزا کا حکم سنایا۔ لیکن فوجداری کے مقدمات میں سزا کے نفاذ کا اختیار انہیں نہیں، بلکہ سرکاری ملکی عدالتوں کو تھا۔ مقدمہ ملکی عدالت ہی کے سامنے بغاوت و سرکشی کا شروع ہوا۔ پیشی کا دن اتفاق سے جمعہ کا تھا اور وقت سپہر کا ہو رہا تھا۔ یعنی یہود کا مقدس دن سبت شروع ہونے کا تھا۔ عدالت نے آپ کو بے قصور پا کر چھوڑ دینا چاہا۔ ادھر یہود کا مجمع جو عدالت کے اردگرد لگا ہوا تھا، وہ بلوہ پر آمادہ ہو گیا۔ اور لگا نعرے لگانے کہ اس مجرم یسوع کو پوری سزا دو ورنہ ہم تمہارے فیصلہ کے خلاف قیصر کے دربار میں فریاد لے کر جائیں گے۔ جج نے آخری سولی کا حکم سنا دیا کہ ملکی قانون میں بغاوت کی سزا سولی ہی تھی۔ سولی گھر عدالت سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر تھا اور سولی (صلیب) کا عمودی ستون سولی گھر ہی میں نصب رہتا تھا۔ البتہ آڑا ستون عدالت میں رہتا تھا اور اسے ہر مجرم اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک لے جاتا تھا۔ آپ لاغر کمزور تھے۔ اتنی مسافت اتنا وزن لاد کر آسانی سے نہیں طے کر سکتے تھے۔ ادھر آپ کے ہم قوم (یہودی) غنڈے اُدھم مچا رہے تھے۔ اور ادھر جمعہ کی شام ہو رہی تھی، یعنی سبت شروع ہو رہا تھا اور اس کے بعد یہود کا ہر کام ۲۴ گھنٹے کے لیے معطل رہتا تھا۔

اب رومی سپاہیوں نے جو (ایک بار پھر اس حقیقت کو خیال و شعور میں تازہ کر لیجیے، علاوہ نسل، مذہب کے وضع و لباس، شکل و قیافہ، رنگ و زبان ہر لحاظ سے فلسطینی یا اسرائیلی باشندوں سے ایسے ہی مختلف تھے جیسے گورے (انگریز فوجی) ہندوستانیوں سے مختلف ہوتے تھے۔ بھنا کر وہ سولی والا ستون ایک شورہ پشت یہودی کی پیٹھ پر لاد دیا جو شرارت میں سب سے پیش پیش تھا اور جب سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچے تو وہاں کے رومی سپاہیوں نے یہ سمجھ کر کہ ستون مجرم ہی کی پشت پر ہوگا اور اسی بدبخت اسرائیلی یا یہودی کو پکڑ لیا اور اسی کو سولی پر چڑھا دیا۔ وہ اپنی زبان میں چیخ پکار کرتا رہا مگر یہ اجنبی ملک و زبان والے اس چیخ پکار کو کچھ نہ سمجھے اور حضرت مسیحؑ اس طرح صاف مصلوبیت سے بچ کر نکل آئے۔ واقعہ کا پورا علم تو عالم الغیب ہی کو ہے، لیکن حالات گرد و پیش کی روشنی میں دل نشین اور مقتضائے حال کے مطابق یہ تعبیر کسی درجہ مناسب معلوم ہو رہی ہے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲)

تاریخ سے بالکل ملا ہوا دوسرا نمبر جغرافیہ کا ہے۔ قرآن مجید کا تعلق تاریخی عنوانات سے تو نمبر اوّل کا ہے، لیکن اس کے بعد ہی جغرافیہ سے ہے۔ فرعون کے عہد میں ذکر بنی اسرائیل کی ہجرت کا آتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ ''بحر'' کا بھی آیا ہے اور یم کا بھی۔ جسے اسرائیلیوں کو طے کرنا پڑا تھا۔ اُردو میں دونوں کا ترجمہ سمندر سے ممکن ہے۔ پرانے مفسرین نے اس کا اشارہ دریائے نیل کی جانب سمجھا ہے اور اُردو مترجمین نے اس کا ترجمہ دریا سے کیا، جو فارسی میں سمندر کا مترادف ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل جس مقام پر مصر میں رہ رہے تھے، اس کا نام انگریزی تاریخ میں گوشن (Goo chan) اور اُردو تلفظ ''مین جشن'' تھا۔ دریائے نیل اس سے فاصلہ پر، اور بالکل مخالف سمت میں واقع تھا۔ فلسطین و شام مصر کے مشرق میں تھے اور اسرائیلیوں کو یہیں آنا تھا۔ نیل سمتِ مغرب میں تھا اور وہ اس راستہ پر سرے سے پڑتا ہی نہ تھا۔ اسرائیلی جشن سے چلے اور رات کے اندھیرے میں بجائے شمال مشرق میں دُور تک چلے جانے کے وہیں مڑ گئے۔ یہاں پہلے سمندر اپنی تنگ صورت میں تھا، یہ بحرِ احمر یا بحرِ قلزم کا شمالی نکتہ، حصۂ خلیج یا آبنائے کی صورت میں تھا جہاں سمندر کا پاٹ کل ڈیڑھ دومیل رہ گیا تھا۔ اب صبح ہو چکی تھی اور اب انہیں سمندر کا سامنا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے وحی الٰہی سے آگاہ ہو کر انہیں اسی سمندر میں گھس پڑنے کا حکم دیا، سمندر کا پانی سمٹ کر کھڑا ہو گیا اور پانی کی دیوار سی بن گئی۔ یہ لوگ خشک سمندر کو طے کر کے دوسرے ساحل پر آ گئے۔ نقشہ دیکھنے سے جغرافی حقیقت بالکل آئینہ ہو کر رہتی ہے۔

اسی طرح حضرت یونسؑ کا جو ذکر آتا ہے تو یہ یونس بن متیٰ ایک اسرائیلی پیمبر تھے۔ اُن کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط کا تھا۔ آپ معاصر تھے، اسرائیلی بادشاہ کے، اس کا عہد ۷۵۱ء سے ۷۴۱ قبل مسیح تک کا ہے۔ آپ کا مستقر شہر نینوا تھا۔ یہ عراق کا شہر تھا اور ملک اسیریا (آشوریہ) کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ اب بغداد اس کے قریب واقع ہے، سامنے دریائے دجلہ بہہ رہا ہے۔ آپ اپنی قوم سے ناخوش ہو کر قبل اجازت الٰہی اپنے شہر سے رخصت ہو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلے اور سفر بحری اختیار کیا۔ جہاز پر جا رہے تھے کہ جہاز طوفان میں گھر گیا۔ جہاز والوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق فال نکالی تو بحیثیت قصوروار آپ کا نام نکلا۔ اس پر جہاز والوں نے آپ کو سمندر میں پھینک دیا اور ایک عظیم الجثہ مچھلی شارک قسم کی آپ کو زندہ نگل گئی۔ آپ بہرحال پیمبر اور مقرب الٰہی تھے، آپ نے استغفار و مناجات اس اندھیرے گھپ میں، مکمل گھٹن میں شروع کر دی۔ اس پر آپ کو نجات حاصل ہو گئی۔

ایک اور جگہ حضرت موسیٰ ؑ کو حکم ملتا ہے کہ جب اپنے رفیق سفر کے ساتھ اس جگہ پہنچیں جہاں دو دریائیں ملیں تو وہاں ہمارے بندۂ خاص سے ملاقات ہو گی۔ اور یہ بات ہنوز زیر تحقیق ہے کہ یہ مجمع البحرین یا دو دریاؤں کا سنگم کہاں واقع تھا۔ جب کوئی پتا نشان نہ ہو تو جگہ کی تعیین مشکل ہی ہے۔

لیکن اگر یہ سفر دورانِ قیام مصر میں تھا، تو عجب نہیں کہ وہ مقام مراد ہو جہاں مغرب میں دریائے نیل کی دونوں شاخین نیلِ ابیض اور نیلِ ارزق ملی ہیں اور جہاں اب شہرِ خرطوم واقع ہے اور ملک سوڈان ہے اور اگر یہ سفر مصر سے نکلنے کے بعد جزیرہ نمائے سینا کے دورہ میں ہے تو قرینِ قیاس ہے کہ یہ مقام اتصال وہاں ہوں جہاں آج بحر قلزم کا کوئی شمالی دو شاخہ یعنی خلیج عقبہ یا خلیج [سویز] ہے۔

اور درجۂ خفیف میں ایک تیسری ممکن شق یہ ہے کہ آپ کا یہ سفر دورانِ قیام مصر سے قبل ہوا ہے۔ اس شق پر اس سفر کا امکان ملک حبشہ کی طرف ہے۔

تاریخی عنوان تو قرآن سے سینکڑوں کی تعداد میں مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن شہروں اور ملکوں مثلاً مکہ، مدینہ، یثرب، مدین اور مصر و بابل اور پہاڑوں اور عمارتوں مثلاً طور سینین، الکہف، کعبہ بیت الحرام، بیت العتیق، جودی، سدین وغیرہ اور معرفہ و نکرہ دونوں قسم کے جغرافی نام بھی کچھ ایسے کم نہیں۔

غرض یہ کہ پچاسوں نام جغرافی حیثیت سے ابھی تحقیق کے انتظار میں ہیں۔

آرکیالوجی یا اثریات کے فن نے گزشتہ ۱۰۰۰ برس کے عرصہ میں بیسویں عقدے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھول دیے ہیں۔ قرآنی گتھیاں جو اس قسم کی ہیں سب انشاء اللہ انہیں علومِ جدیدہ کے واسطہ سے کھل کر رہیں گی۔ کوئی عقدہ لاینحل نہیں رہ جائے گا۔ اندیشہ میں آپ ہرگز نہ پڑیں، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ساری گتھیاں ہماری آپ کی زندگی ہی میں حل ہو کر رہیں، تحقیق کا میدان قیامت تک کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اپنے بس بھر کا کام اپنے زمانہ میں کر جائیے۔

(۳)

تاریخ و جغرافیہ کے بعد تیسرا عنوان مذاہب غیر کا رکھیے اور ان مذہبوں میں بھی نمبر اوّل پر مسیحیت اور یہودیت آتے ہیں۔ یہ دونوں سلسلۂ ابراہیمی کی شاخیں ہیں اور اپنے بنیادی عقیدے اسلام کے ساتھ مشترک رکھتے ہیں۔ یعنی توحید اور نبوت و رسالت اور سلسلۂ وحی و ملائکہ اور جزا و سزا۔ اگرچہ ان عقیدوں کی تعبیر و تفسیر میں ان لوگوں نے بہت کچھ گڑبڑ کر رکھا تھا۔ چنانچہ نبوت کو کہانت کے ہم معنی قرار دے لیا تھا۔ ملائکہ کی عصمت کے منکر ہو گئے تھے اور یوم الجزاء کے عقیدہ کو بھی مسخ کر دیا تھا۔ قرآن مجید نے ان کے قول اور اُن کے عقیدے کثرت سے نقل کیے ہیں اور اُن کی قومی تاریخ پر بھی برابر روشنی ڈالتا چلا گیا ہے۔ کہیں اُن کے عقیدے نقل کر کے ان پر جرح کی ہے اور کہیں ان کی بداعمالیوں پر ملامت۔ ہمارے ہاں کے مفسرین نے اپنے یہاں کے کلامی اور فقہی مسائل پر شرح و بسط سے بحث کی ہے اور جزئیات کو تحقیق کی حدوں سے بھی گزر کر تدقیق کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن دوسرے مذہبوں سے چونکہ سابقہ بہت کم پڑا ہے، قرآن مجید کی تلمیحات و اشارات کو پوری طرح نہ سمجھ سکے۔

قرآن مجید نے مسیحی شرک کے، دو مستقل اور الگ الگ مسئلے درج کیے ہیں۔

(۱) ایک ولدیت مسیحؑ

(۲) دوسرے ابنیت مسیحؑ

پہلا مسئلہ شدید تر، اور شنیع تر، کھلا ہوا شرک اپنی بدترین صورت میں ہے۔ وہ بڑی ہی سخت بات ہے جو یہ اپنے منہ سے نکال رہے ہیں۔ **كبرت كلمة تخرج من افواههم.** (**الكهف: ع ۱**) اور کہیں الفاظ سے بھی زیادہ زوردار ہیں مثلاً یہ کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو کر گر پڑیں۔

تکاد السماوات یتفطرن و تنشق الارض و تخر الجبال ھدا.

(مریم: ۹۰) ولد کا ترجمہ اُردو میں بیٹا ہے اور انگریزی میں son، چنانچہ انگریزی بائبل میں اس موقع پر یہی لفظ آیا ہے اور یہ عقیدہ مسیحیوں کے سوادِ اعظم کے ساتھ مخصوص ہے۔

دوسرا عقیدہ کہ وہ بھی غلط اور کافرانہ ہے۔ ابنیتِ الٰہی کا ہے۔ ضلالت میں صُلبی بیٹے کے عقیدے سے کہیں ہلکا ہے۔ اور اس کے لیے قرآن میں جو آیتیں ہیں، وہ زجر اور ملامت میں نسبتاً ہلکی ہیں۔ ابن کا اطلاق صلبی بیٹے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا ترجمہ اُردو میں بیٹے سے نہیں، لڑکے سے کیا جائے گا اور انگریزی میں child سے۔ چنانچہ انگریزی بائبل میں اس موقع پر یہی لفظ آیا ہے۔ اور یہ بائبل میں صیغۂ واحد و صیغۂ جمع دونوں میں آیا ہے یعنی child بھی اور children بھی۔ یہ لفظ ولد اللہ کی طرح لفظی معنی میں نہیں آیا، بلکہ مجازی معنی میں آیا ہے۔ توریت، انجیل اور قرآن سب میں child of lord سے مراد ہے اللہ کا محبوب چہیتا، دلارا۔ اس ابنیت کے دعوے میں مسیحی تنہا نہ تھے بلکہ یہود بھی مسیحیوں کے شریک و سہیم۔ اور یہود آلِ ابراہیم و آلِ یعقوب ہی کو لطف و کرم الٰہی کا خصوصی مورد و مہبط سمجھتے اور اپنے کو پیدائشی مرحوم و مغفور جانتے تھے۔ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کا دعویٰ **نحن ابناء اللہ و احباء ہ** (**المائدہ: ۱۸**) اسی معنی میں نقل ہوا ہے کہ ہماری قوم تو خدا کی برگزیدہ و مقبول ہے اور ہم اس کے چہیتے لاڈلے، دُلارے ہیں۔ ہم خاصانِ خدا میں ہیں، ہمارا اور عام مخلوقِ بشری کا مقابلہ ہی کیا۔

عزیر عربی تلفظ ہے، بائبل میں اُن کا نام عزرا آتا ہے اور روایاتِ یہود میں اُن کا ذکر ایک نبی مرسل سے بڑھ کر کاتبِ توریت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اُن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط کا ہوا ہے اور اُن کا سالِ وفات بہ ظنِ غالب ۴۵۵ ق م ہے۔ بخت نصر تاجدار اسیریا ۶۰۴ تا ۵۹۱ ق م کے حملہ یروشلم ۵۸۶ ق م اور یروشلم اور خود نسخی توریت کی کامل تباہی و بربادی کے بعد جب اُنہوں نے توریت کا نسخہ اپنی یادداشت سے ازسرِ نو مرتب کر کے دیا تو اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احسانِ عظیم اور خدمتِ جلیل پر یہود انھیں مثیلِ موسیٰؑ قرار دینے لگے اور بعض نے غلو کر کے اس سے بھی انھیں بڑھا دیا یعنی اپنا مطاع کل انھیں کو سمجھنے لگے۔

یہود جو آج اکڑ اکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ مسیحیوں نے مسیح کو جو کچھ بھی مانا ہو، ہم نے عزیر کو ابن اللہ کہاں اور کب مانا ہے؟ یہ قرآن نے سرتا سر ہم پر غلط الزام لگا دیا۔ یہ آیت کے صحیح مفہوم تک نہ پہنچنے کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے تو ایک کھلی ہوئی حقیقت بیان کر دی، بشرطیکہ ولد اور ابن کا فرق ملحوظ رہے اور مفسر جدید یہی معنی، مفہوم پیش کر کے یہود کی زبان بند کر سکتا ہے۔

اور اس مفہوم کی مزید قرآن کی اس عبارت سے ہو جاتی ہے جو معاً اس کے بعد اور اس سے متصل آئی ہے۔

ذالک قولهم بافواهم یضاهئون قول الذین کفروا من قبل قاتلهم اللّٰه انی یؤفکون. (التوبہ: ۳۰)

یہ اُن کا قول ہے (محض) منہ سے بک دینے کا۔ یہ انہیں لوگوں کی ریس کرتے ہیں جو ان سے پیشتر کافر ہو چکے ہیں۔ اللہ انہیں غارت کرے یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔

یعنی یہ اہلِ کتاب اپنے ان مہمل عقیدوں میں ریس انھیں مشرک قوموں کی کر رہے ہیں۔ جو عقیدہ تجسیم الٰہ کی قائل ہوئی ہیں اور جو عقیدہ حلول کی ماننے والی ہوئی ہیں۔ مثلاً یونانی، رومی اور اُن سے بھی قبل مصری اور اپنے نسب ونسل پر نیم مشرکانہ گھمنڈ تو ہندوستان کے برہمنوں کو اور راجپوتوں کے سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کو رہا ہے۔

یہ فضل وشرف جرمنی، فرانس، برطانیہ وغیرہ کے ان فاضلوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے جنھوں نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے سارے صحیفوں پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اُن کے ماخذوں کو کھود کھود کر نکالا۔ قرآن مجید ایک امی کی زبان سے ان کی نشان دہی تیرہ سو برس پہلے ہی کر گیا اور یہی ایک اعجازی دلیل اس کی حقانیت کے لیے کافی ہے۔

یہود کے قول قرآن مجید میں کثرت سے نقل ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ زعم کہ ہم کو آگ کا شعلہ چھوئے گا بھی نہیں۔ بجز گنے چنے چند دن کے، **قالوا لن تمسنا النار الا ایاما**

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معدودات۔ ایسے موقعوں پر مفسرِ جدید کو چاہیے کہ توریت کو اور یہود کے دوسرے مذہبی نوشتوں کو کھنگالے اور حوالے اُن کے صفحات سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کرے۔

اہلِ کتاب کے اقوال تو خیر کثرت سے ملیں گے ہی، دور کے اشاروں سے جاہلی مذہبوں کے متعلق بھی قرآن خالی نہیں۔ ایک حوالہ تو حضرت عزیر والی آیت کے سلسلے میں ابھی گزر چکا ہے۔ یہودیت و نصرانیت کے علاوہ دو اور مذہبوں کا حوالہ قرآن مجید نے نام کی صراحت کے ساتھ لیا ہے۔ ایک مذہب مجوس، دوسرے مذہب صابی۔

یہ دونوں زمانۂ نزولِ قرآن میں سرحدِ عرب پر اچھے خاصے موجود تھے، عرب کا اُن سے کلچرلی (ثقافتی) لین دین رہتا تھا، اور سفری و حضری سابقے برابر رہتے تھے۔ ان مذہبوں سے بہ قدرِ ضرورت واقفیت مفسرِ جدید کے لیے لوازم میں ہے۔ اور ان دو کے علاوہ اور بھی قدیم مذہبوں کا ذکر بالا جمال جابجا قرآن مجید میں موجود ہے۔ مثلاً پارۂ ششم کی سورۃ المائدہ کی آیت، حسب ذیل ہے:

قل یا اهل الکتب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق ولاتتبعوا اهوآء قوم قدضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل۔ (المائدہ:۷۷)

"آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی من مانی باتوں پر نہ چلو جو پہلے سے گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہِ راست سے (بہت) بھٹک چکے ہیں۔"

اور یہاں اہلِ کتاب میں سے خطاب خصوصی جیسا کہ ابنِ جریر طبری وغیرہ نے تصریح کی ہے، مسیحیوں سے ہے اور مسیحیوں کی بابت اب یورپ ہی کے اہلِ علم وفضل شہادت دے رہے ہیں کہ ابتدائی مسیحیت پر چھاپ مصری اور یونانی اور اُن سے بھی بڑھ کر رومی شرک کی اچھی خاصی لگی ہوئی ہے اور پولوس نے عقائد میں مسیحیت کو اپنی والی ایک بھرپور شاخ یونانیت کی بنا کر رکھ دی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ قرآن مجید کی اس نشان دہی پر نقدیاتِ انجیل والوں کا ہاتھ بٹائیں اور اُن کی تحقیق و تدقیق سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہیں کہیں قرآن کی نشان دہی عمومی نہیں بلکہ متعین ہو کر رہی ہے۔ ان حوالوں کی تلاش اور زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے سورۃ المائدہ کی آیت ۷۸ میں کہ داوٗد نبیؑ اور عیسیٰؑ نبی دونوں بنی اسرائیل پر اُن کی گمراہیوں اور بدراہیوں کی بنا پر لعنت کر چکے ہیں اور یہ دونوں لعنتیں علی الترتیب عہدِ عتیق کے صحیفہ زبور میں اور عہدِ جدید کے صحیفہ متیٰ میں مل جاتی ہیں۔

حضرت داوٗدؑ کی زبان سے زبور باب ۷۸ میں آیات ۲۱،۲۲،۲۳ میں ہے۔

خداوند نے سنا اور نہایت غصہ ہوا۔ اس لیے یعقوب میں ایک آگ بھڑکائی گئی اور اسرائیل پر قہر بھی اُٹھا، کیونکہ اُنہوں نے خدا پر اعتماد نہ کیا اور اس کی نجات کا اعتقاد نہ رکھا۔

اور حضرت عیسیٰ مسیح کی زبان سے انجیل متیٰ کے باب ۲۳ کی آیات ۳۱،۳۲ میں ہے:

غرض اپنے باپ دادوں کے پیمانہ بھر دو، اے سانپو، اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟

بنی اسرائیل کا یہ کفر اپنے پیمبروں کے مقابلہ میں تھا، چنانچہ حضرت داوٗد کے زمانہ میں تو اُنہوں نے صاف صاف سبت کو توڑا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے مقابلہ میں اتنا حد سے گزرے کہ ان کی نبوت ہی سے سرے سے انکار کر دیا۔

اسی طرح قرآن مجید نے ایک اور جگہ متعین طور پر توریت و انجیل کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ہم نے مومنین صادقین صحابۂ رسول کے اوصاف ان میں لکھ دیے ہیں۔

محمد رسول الله و الذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله و رضوانا سيما هم في وجوههم من اثر السجود ذالک مثلهم في التوراة و مثلهم في الانجيل كزرع اخرج شطاه فأزره فاستغلظ فاستوىٰ على سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار. (الفتح: ۲۹)

محمد اللہ کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلہ میں اور مہربان ہیں آپس میں تو انہیں دیکھے گا تو کبھی رکوع کرتے ہوئے اور کبھی سجدہ کرتے ہوئے، اللہ کے فضل و رضا کی جستجو میں لگے ہوئے۔ ان کے آثار بھی ان چہروں پر نمایاں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے اوصاف توریت میں ہیں اور ان کے اوصاف انجیل میں ہیں کہ وہ ہیں جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔"

اور اس کے پہلے جزو کے لیے توریت کو کھول کر کتاب استثناء نکالیے اور اس کے باب ۳۳ کی آیت نمبر ۲ پڑھیے۔

"فاران ہی کی پہاڑیوں سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا، اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت اُن کے لیے تھی۔ ہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ساتھ میں ہیں۔ اور تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔"

اب رہا دوسرا جزو۔ تو اس کے لیے ملاحظہ ہو، انجیل متی، باب ۱۳:

آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا اور وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کر لیتے ہیں۔ (۱۴:۳۱)

اور انجیل مرقس کھول کر اس کا باب ۴۰ نکالیے۔

پھر اس نے کہا کہ ہم خدا کی بادشاہت کو کس سے تشبیہ دیں اور کس تمثیل میں اسے بیان کریں! وہ رائی کے دانہ کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو وہ زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر جب بویا گیا تو اُگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ پر بسیرا کر سکتے ہیں۔ (۳۰-۳۲ نیز لوقا ۱۳:۱۸-۱۹)

(۴)

دوسرے مذہبوں کے ضمن میں ان کے عقیدوں کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑی اہمیت رکھتی ہے، خاص کر بنی اسرائیل کی اعتقادی، اخلاقی، اجتماعی زندگی کے ساتھ اس کی تاریخ کو بھی قرآن مجید نے بڑی اہمیت دے رکھی ہے اور مفسر پر لازم ہے کہ تاریخِ یہود پر اگر تفصیلی نہیں تو اجمالی نظر ضرور رکھے، کسی اور قوم کے حالات اس جزئی تفصیل سے قرآن نے نہیں بیان کیے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے۔ اور پھر اپنے نشیب و فراز کی داستان میں دو مرتبہ جو اسے سخت ترین شکست نمونۂ قیامت سے سابقہ پڑا ہے۔ دونوں انقلاب آفرین واقعات کو قرآن میں پڑھ کر پھر تاریخِ عالم سے اس کا مقابلہ کیجیے اور دیکھئے کہ قرآن کی اعجازی صلاحیت کس مرتبہ کی ہے۔

ایک لطیفہ اور اس سلسلہ میں سن کر اپنے دل کو خوش کرتے چلیے، گو اس کا تعلق موضوع سے براہِ راست نہ ہو۔ دُنیا، مہذب اور علمی دُنیا، قرآن کے اس بیان کے خلاف بائبلی بیان کو یعنی حضرت سلیمانؑ کے نعوذ باللہ کفر و شرک کو سینکڑوں ہزاروں برس تک پڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی آ گئی اور صدی کی شاید سب سے زیادہ فاضلانہ محققانہ تصنیف انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کو لکھنا پڑا:

Soloman was a sincere worshipper of yahweh.

''سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔'' (جلد۲، ص۸۹، ک۲، طبع چہارم)

آپ اتنا ہی سُن کا جھوم پڑے ہوں گے، اس کے آگے ایک وجد آفریں شہادت اور سنیئے:

اس بیسویں صدی کی ایک محققانہ کتاب خاص مسیحی فاضلوں ہی کی مرتب کی ہوئی، انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کے نام سے ہے، اس میں یہی نہیں کہ بائبل کی جو الزامی آیتیں ابھی آپ سُن آئے ہیں، اُن کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی ہوئی اور الحاقی ہیں، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں! اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی، لیکن اُنہوں نے نہ تو سب کے لیے قربان گاہیں تیار کرائیں اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ اُن بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا۔ (کالم ۴۶۸)

خیر قرآن تو اللہ کا کلام ہے۔ اس کا اعجاز اس سے بھی بڑھ کر ہر صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔ لیکن بعض اس کے خدمت گزار بندے اپنی محدود اور اسی ناقص عقل اور زمانی و مکانی قیدوں سے گھرے ہوئے علم کے باوجود محض اپنی ایمانی فراست سے جو کام کر گئے، وہ بھی اعجاز سے کم نہیں۔ رئیس المفسرین ابنِ جریر طبری آج کے نہیں، ایک ہزار سال قبل تیسری صدی کے آدمی ہیں اور نہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کا خصوصی علم رکھتے تھے، وہ اپنی جامع تفسیر میں محمد بن اسحاق صاحب السیرۃ کے حوالے سے یہ روایت بہ صراحت نقل کر گئے ہیں کہ آیت یہود کے عقائد کے رد میں نازل ہوئی ہے، جو آپس میں یہ چرچا کرتے تھے کہ ذرا ان نئے مدعیٔ نبوت کی نادانی تو دیکھو کہ ابن داؤد کو نبی اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بخدا وہ تو ایک ساحر تھا! اللہ نے انھیں کے قول کے رد میں یہ آیت نازل کی ہے۔

ایک اور مثال اسی سلسلہ کی ملاحظہ ہو، سورۂ یوسف میں جہاں یہ ذکر ہے کہ عزیزِ مصر نے جب قحط عظیم کے زمانہ میں قافلۂ بنی یعقوب کو غلہ دے کر اپنے ہاں سے اُن کے وطن واپس کیا ہے تو ان کے شلیتے میں رکھ کر ان کی ''بضاعت'' انھیں واپس کر دی تھی، لفظ یہاں ''بضاعت'' کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل جب خود یوسف علیہ السلام غلام بن کر ایک تجارتی قافلہ کے ہاتھ بکے ہیں تو وہاں لفظ ''ثمن'' آیا ہے، جس کے صاف معنی قیمت کے ہیں۔ اب جن مترجمین نے ''بضاعت'' کا ترجمہ بھی ''نقدی'' سے کیا ہے، اُنھوں نے بضاعت کے وسعتِ مفہوم پر غور نہیں کیا۔ بضاعت کا ترجمہ لازمی طور پر ''نقدی'' نہیں، بلکہ مال کے عوض میں جو دوسرا مال جاتا ہے، اس کے لیے بھی یہی لفظ آ سکتا ہے، انگریزی میں اسے Barter سے تعبیر کرتے ہیں۔

نقدی اور سکہ کی ایجاد سے پہلے طریقہ جنس سے جنس بدلنے کا تھا۔ اب جس کو دُنیا کے بازار کے اس عرف سے واقفیت ہوگئی کہ نقدی کے چلن سے پہلے بدلائے کا رواج رہا ہے، وہ آسانی سے اسے سمجھ لے گا کہ حضرت یوسفؑ کے زمانہ تک دُنیا میں ہر جگہ نقدی کا رواج نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلاتا تھا۔ بلکہ کسی ملک (مثلاً فلسطین) میں سکہ چلنے لگا تھا، اور کسی ملک (مثلاً مصر) میں ابھی تک بدلائی ہی چل رہی تھی! قرآن نے چھوٹے بڑے سارے ہی معاملات میں جتنا لحاظ باریکیوں اور نزاکتوں کا رکھا ہے، وہ کسی بندے کے بس میں کہاں آ سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ کلام اللہ کی شرح کا حق بھی اللہ ہی ادا کر سکتا ہے؟ کسی ایک بندہ کا سوال نہیں، سارے بندے اگلے اور پچھلے آئندہ اور گزشتہ مقبول و برگزیدہ مل کر کرنا چاہیں، جب بھی نہیں کر سکتے۔

(۵)

پانچویں نمبر پر یہ جاننا ہے کہ ایک زمانہ میں قرآن مجید کو صرف عقیدوں کے معیار سے جانچا جاتا تھا۔ توحید، معاد، صفاتِ باری وغیرہ اور ہمارے قدیم متکلمین اور کلامی مفسرین انہیں مسائل پر دلائل قائم کرتے تھے۔ اب زمانہ یہ آ گیا ہے اور لوگوں کے مزاج میں مادیاتی ماحول کے اثر سے اتنی تبدیلی ہوگئی ہے کہ اب بجائے عبادات، نفسیات اور ماحولیات کی گفتگو کے زیادہ تر غور و فکر احوال اور اعمالِ ظاہری اور معاملات پر ہوتی ہے اور اخلاق انفرادی ہوں یا اجتماعی، حکومت شخصی ہونا چاہیے یا عوامی، غلامی کا وجود اب ناقابلِ برداشت ہے یا نہیں، جہاد یا حرب کے قیود و حدود اب کیا ہونے چاہئیں؟ لین دین میں سود کا جواز کچھ رہنا چاہیے؟ شراب اور نشہ بازی کا دخل معاشرہ میں کس حد تک جائز ہے؟ زن و مرد کے درمیان نسبت مساوات کی رہنا چاہیے یا افسری اور ماتحتی کی؟ مذہبی و غیر مذہبی محاربات کس سطح پر ہوں؟ غرض فلسفہ، اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ کے بیسیوں بلکہ پچاسوں نظریات نکل پڑے ہیں، اور مذہب پر گفتگو انہیں دائروں کے اندر رہتی ہے۔

قرآن کا اپنا معیار ان میں سے اکثر مسائل سے متعلق مخصوص ہے۔ بعض چیزوں پر اس نے پورا حکم دیا ہے۔ ان کے ترک و اختیار کو کہیں فرض اور کہیں واجب ٹھہرایا ہے۔ اور بعض کو ان کے برعکس حرام و معصیت بتایا ہے۔ بعض کو مرتبۂ مباح میں رکھا ہے۔ مفسرِ قرآن کو ان التزامات کی پوری پابندی رکھنی ہے، البتہ جن معاملات کو معاشرہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے اور وہ اپنے مظاہر میں شدت اور قوت کے ساتھ ملتے بھی نہیں ہیں، مثلاً غلام کہ اب عملاً ملتے ہی نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور رسمِ غلامی عملاً ختم ہو چکی ہے، ان پر زور دینے کی ضرورت نہیں، صرف ان کا سرسری تذکرہ کافی ہے کہ اس کا امکان تو بہر حال ہے کہ وہی حالات دوبارہ رونما ہو جائیں۔ اور جن مسائل کو بطور محکمات زور و تاکید اور قطعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً احکامِ ترکہ و وراثت یا تعدد ازواج یا نوعیت طلاق، ان میں مغربی نظریات سے مرعوب ہو کر ان میں نرمی اور رواداری برتنے کے بجائے ان سب کے وجوب و نصرت میں نئے نئے دلائل و شواہد مذاق عصری کے مطابق ڈھونڈ ڈھونڈ کر فراہم کرتے رہنا چاہیے۔ حرام کاری، فحش پسندی، عریانی، غیر طبعی شہوانیت کے لیے نقاب جیسے جیسے خوشنما تیار کر لیے جائیں، مفسر کو بہر حال ان خطرات سے اور اس دام ہم رنگ زمین سے بچنا اور ہر صورت میں آیاتِ الٰہی کے نگہبان کی حیثیت سے اپنی جگہ پر مضبوطی سے قدم جمائے رکھنا ہے۔ بدی کی کثرت اور اس کے کر گزرنے کی سہولتیں ہرگز اس بدی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتیں۔

(۶)

یقینی مسائل کی صورت ان نظری بحثوں اور مجادلوں سے مختلف ہے۔ قرآن کا ایک اعجازی وصف اس کی لچک داری ہے۔ ہر ہر لفظ، معنی اور مفہوم کا ایک گنجینہ ہے اور الفاظ کی ترکیب متعدد پہلوؤں کی حامل۔ یہ وصف یوں تو بجز احکام اور بنیادی عقائد کے اور ساری عبارتِ قرآنی میں نمایاں ہے لیکن جب تک دُنیا کے آسمان پر نظام بطلیموسی کے بادل چھائے رہے، اور حکمائے عصر و عقلائے دہر زمین کو ساکن اور فلک کو سقف سمجھتے رہے، قرآن کی آیتوں کی ایسی تاویلیں کی جاتی رہیں کہ ان سے اسی نظریہ کی تائید و تقویت ہوتی رہی۔ لیکن جب سے افق پر موجودہ سائنس کا سورج چمکا، اور چاند ستارے، سورج سب اپنی جگہ حرکت کرتے نظر آنے لگے۔ قرآن کھلے لفظوں میں اعلان کرنے لگا:

وسخر لکم الشمس و القمر دائبین. (ابراھیم: ۳۳)

اور ہم نے سورج اور چاند کو تمہارے تابع کر دیا کہ دونوں پڑے چکر کھا رہے ہیں۔

اور الشمس والقمر بحسبان. (رحمٰن: ۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش میں ہیں۔

اور **لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون.** (یٰس: ۴۰)

نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ چاند کو پا جائے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ جانے والی ہے۔ ہر اک شے ان میں سے اپنے مدار میں پڑی تیر رہی ہے۔

اور **والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم.** (یٰس: ۳۸)

اور سورج اپنے ٹھکانے پر رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ اندازہ خدائے زبردست و علیم کا باندھا ہوا ہے۔

جیسے اب تک اس قسم کی آیتوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب سب حجاب اُٹھ گیا ہے۔

ایسے موقعوں پر مفسر کو بڑی احتیاط، اعتدال اور سلامت روی کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن سائنس کے کسی شعبہ کی ٹیکسٹ بک نہیں اور نہ اس کا مقصد قوانینِ طبعی وتکوینی کی تعلیم دینا ہے، وہ اصلاً کتاب صرف ایمانیات اور اخلاقی ہدایات کی ہے۔ طبعیات و مادیات اس میں صرف تمثیلاً آتے گئے ہیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ کتاب اللہ اور صحیفۂ فطرت کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم معلوم ہونے لگے۔ لیکن ساتھ ہی دوسری طرف ان سائنسی حقائق کی تائید وتبیین میں اتنا زور بھی نہ دیجیے کہ قرآن انہیں کا ترجمان و مبلغ نظر آنے لگے۔ پرانے حضرات یونانی فلسفہ کے غلبہ اور اقتدار کے زمانہ میں اسی مرعوب ذہنیت کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ آپ بھی اسی مرعوب ذہنیت کا شکار نہ ہو جائیے۔ یہ بنیادی نکتہ یاد رہے کہ انسانی تحقیق بڑی سے بڑی سہی، پھر بھی بشری دماغ کی پیداوار ہے اور ہر وقت، ہر آن اس میں ترمیم، تنسیخ، تردید، تغلیط ممکن ہے اور واقعتاً ہوتی بھی رہتی ہے۔

یہ بنیادی بات ذہن میں اُتار لیجیے کہ قرآن مجید کسی بھی صحیح فلسفہ، کسی بھی صحیح نظریہ، کسی بھی صحیح فارمولے کا مخالف نہیں، لیکن یہ اور چیز ہے اور یہیں تک اپنے دعویٰ کو رکھیے۔ اور یہ بالکل دوسری چیز ہے کہ قرآن یونانی یا مصری یا ہندی یا رومی، روسی یا امریکی علم کی فلاں تھیوری کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کرنے والا ہے۔ دونوں دعووں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس فرق کو ذہن و شعور کی جڑ میں رکھئے اور قرآن کی کسی شرح و ترجمانی میں بھی اس فرق کو مٹنے نہ دیجیے۔

(۷)

معنی و مفہوم سے قطع نظر، لفظ و عبارت قرآنی کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ہرگز خیال میں نہ آنے پائے کہ کسی لفظِ قرآنی کی بجائے لغت کی مدد سے کوئی بھی دوسرا مترادف لفظ رکھ کر اس سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ جہاں قرآن کے لفظ لفظ میں بے انتہا لچک ہے، وہاں دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ کسی غیر قرآنی مفہوم کو لے کر کسی بھی سند، شہادت یا قیاس کی بنا پر قرآن کو اس کا ذمہ دار ہرگز نہ بنایا جائے۔

قرآن مجید نے حضرت داؤد کے سلسلہ میں صرف اتنا کہا کہ

و علمنہ صنعۃ لبوسٍ لکم. (الانبیا: ۸۰)

ہم نے داؤد کو تمہارے لیے ایک لباس جنگ (زرہ) بنانا سکھا دیا۔

اور واقعی آپ ایک اعلیٰ درجہ کے زرہ ساز تھے۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ آپ زرہ کے موجد تھے اور آپ سے پہلے کوئی اس لباسِ جنگ سے واقف نہ تھا؟ اب اگر یہ تاریخ سے ثابت ہو جائے کہ تاریخِ اسلحۂ دفاع میں زرہ کا استعمال حضرت داؤد کے زمانہ سے پیشتر سے تھا، اس سے قرآن مجید پر کیا زد پڑتی ہے؟ روایتوں کو روایتوں کی حد تک رکھئے، قرآن مجید سے ان کا خلط ہرگز گوارا نہ کیجیے۔

اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں قرآن کی صراحت اسی حد تک ہے کہ تیز ہوا اُن کے تابع کر دی گئی تھی اور وہ اس سے شام کی طرف سفر میں کام لیتے تھے۔

ولسلیمٰن الریح عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا. (انبیاء: ۸۱)

اور ہم نے زور کی ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا، وہ ان کے حکم سے چلا کرتی تھی، اس ملک تک جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی، یعنی ملک شام تک۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسری جگہ ہے:

فسخرنا له الريح تجرى بامره رخاء حيث اصاب. (ص: ۲۶)

ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کر دیا تھا، کہ وہ جہاں پہنچنا چاہتے تھے، اُن کے لیے وہ نرم نرم چلنے لگتی۔

اور تیسری جگہ ہے۔

ولسليمٰن الريح غدوها شهر و رواحها شهر. (سبا: ۱۲)

اور ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا کہ اس کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی تھی اور شام کی منزل بھی مہینہ بھر کی تھی۔

گویا قرآن نے ہوا پر حاکم و متصرف تو حضرت سلیمانؑ کو بیان کر دیا، لیکن صراحت تینوں میں سے ایک جگہ بھی نہیں کی ہے کہ آپ تخت یا مسند پر بیٹھ کر ہوا پر اُڑتے بھی تھے۔ اس لیے تاریخ میں جب تک آپ کو حضرت سلیمان کی ہوائی پرواز کا ذکر نہ مل جائے، آپ قرآنی تفسیر میں اس پر قانع رہیے کہ حضرت کے لیے جہاز و کشتیاں سمندر میں خوب دوڑا کرتی تھیں اور جہاز ظاہر ہے کہ دخانی نہیں، بلکہ تمام تر بادبانی ہوتے تھے۔ اور اس سے آپ کی قدرت ہوا پر کافی حد تک ثابت ہوتی ہے۔ قرآن نے قدیم جہاز رانی کے سلسلہ میں جس حد تک دخلِ عظیم ہوا کا سمجھا ہے، اسے خود قرآن کی زبان سے سنیے:

هو الذى يسيركم فى البرّ و البحر حتّٰى اذا كنتم فى الفلك و جرين بهم بريح طيبة و فرحوابها جاء تها ريح عاصف وجاء هم الموج من كل مكان. وظنوا انهم احيط بهم دعووا الله مخلصين له الدين. (يونس: ۲۲)

یہ وہی اللہ ہے جو تم کو خشکی اور سمندر میں لیے لیے پھرتا ہے، چنانچہ جب تم کشتی پر بیٹھتے ہو اور کشتی لوگوں کو ہوائے موافق کے ذریعہ سے لے چلتی ہے اور لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ ناگہاں تھپیڑا ایک ہوا کا آتا ہے اور ان پر موجیں، ہر طرف سے آنے لگتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بس گھر گئے اور اللہ کے ساتھ اپنے اعتقاد کو بالکل خالص کر کے یہ دُعا کرنے لگتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں...... (الخ)

دیکھیے! کشتی وہی، سمندر وہی، مسافر وہی۔ لیکن محض ہوا کی تبدیلی ہے، ہوائے موافق کے بدل جانے سے کتنا فرق عظیم کشتی کی حالت اور کشتی نشینوں کی حالت میں پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح الفاظِ قرآنی سے بے احتیاطی برتنے اور لفظی احتیاط نہ رکھنے نے اشکال پیدا کر دیا ہے کہ سورۂ مائدہ کے ختم پر ہے کہ:

و لتجدن اقربهم مودة للذين قالوا انا نصارىٰ ذالک بان منهم قسيسين ورهبانا وانهم لايستكبرون. (سورة مائده: ۸۲)

دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تم انھیں پاؤ گے، جو کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اشکال مشاہدہ کی بنا پر پیدا ہو رہا ہے۔ آج سے نہیں مدت دراز سے عیسائی قومیں کہاں ہماری دوست ہیں، الٹی دشمن ہیں۔ قرآن نے انھیں ہمارا دوست یا ہم سے قریب کیسے کہہ دیا ہے؟ جواب میں عرض ہے کہ قرآن نے ان قوموں کو جو اپنے کو مغربی یا فرنگی کہتے ہیں، کہاں آپ کا دوست قرار دیا ہے؟ وہ تو صرف ان قوموں کو آپ کا دوست کہتا ہے، جو مسیح ناصری کی اصل تعلیم کے قریب تھے، قریب تھے روحانیت کے، ضد اور تکبر سے خالی تھے۔ آیت میں لفظ قالوا خصوصی اہمیت رکھتا ہے یعنی وہ اپنی زبان سے اس کا اعتراف بھی کرتے جاتے ہیں کہ ہم تو نصرانی ہیں، مسیح ناصری کے ماننے والے ہیں۔ ہم جرمنی نہیں، اطالوی نہیں، انگریز نہیں، امریکی نہیں، ہم ایک قوم وطنی، ملکی، سیاسی گروہ نہیں۔

لفظی احتیاط نہ رکھنے سے بڑے بڑے مستشرقین غوطہ کھا گئے ہیں اور اپنے جہل کی پردہ دری کر گئے ہیں۔ نولڈکی کوئی معمولی فاضل نہیں، اسلامیات کے فاضلوں کا سرخیل سمجھا گیا ہے اور قرآن ہی کا ماہرِ خصوصی، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے گیارہویں ایڈیشن میں قرآن پر مقالہ اسی کے قلم سے ہے، اس میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ چونکہ مصنف قرآن کو عرب سے باہر جانے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا، اس لیے بیرونِ عرب کے جغرافیہ سے واقف نہ تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی باتوں سے اُن کی ناواقفیت ظاہر ہو رہی ہے۔ چنانچہ سورہ یوسف میں جب شاہ مصر کے خواب کی تعبیر میں یوسفؑ کی زبان سے کہا ہے کہ سات برس کے بعد جب وہ سال آئے گا، جس میں لوگوں پر پانی برسے گا (عام فیه یغاث الناس. یوسف: ۴۹) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مصر کو بھی کوئی برساتی ملک سمجھ رہے تھے، حالانکہ مصر میں غلہ کی پیداوار بارش سے نہیں، بلکہ دریائے نیل میں طغیانی سے ہوتی ہے۔ اعتراض کی جڑ لفظ یغاث ہے، اس کے معنی اس کے نزدیک صرف پانی برسنے کے ہیں۔ حالانکہ یہ جس طرح مادہ غیث سے ہوسکتا ہے، ٹھیک اسی طرح مادہ غوث سے بھی اور خود قرآن مجید ہی میں دوسری جگہ یعنی سورۃ الکہف: ۲۹ میں یغاثوا اسی غوث سے ماخوذ کھلا ہوا فریادرسی کے معنی میں آیا ہے اور یہاں بھی یغاث کے معنی متعدد اہلِ تفسیر و اہلِ لغت نے فریاد ہی کے لیے ہیں اور اس کا مزید قرینہ یہ ہے کہ فریاد رسی کی اضافت انسانوں یا لوگوں (الناس) کی طرف کی گئی ہے، محض مصریوں کی جانب نہیں۔ قحط کا وقت تو فلسطین وغیرہ کئی کئی ملکوں پر پڑا تھا۔ ان سب کی فریادرسی ہونا قدرتی تھی اور آخر میں یہ کہ اگر بالفرض یغاث کو غیث ہی سے مشتق سمجھا جائے تو آخر کہیں تو پانی برستا ہی ہوگا، جس سے دریا میں طغیانی آتی ہے۔ مستشرق عظیم نے اگر لفظی احتیاط برتی ہوتی تو بیچارہ ایسی عامیانہ بات قلم پر لانے سے رہ جاتا۔

(۸)

آخر میں ایک گزارش بڑے ادب کے ساتھ آئندہ کے سارے مفسرین سے ہے کہ خوارق و معجزات کی اہمیت اپنی جگہ بالکل مسلم، لیکن بلاضرورت، محض روایات کے تحت میں لانے اور ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے قرآن سے خوارق پیدا کرنے کا مسلک صحیح نہیں۔ مثلاً چونکہ قرآن مجید میں الم نشرح لک صدرک. (النشرح: ۱) آیا ہے، اس لیے اس سے ملتے جلتے لفظ ''شرح صدر'' سے ''شقِ صدر'' کا اثبات قرآن مجید سے کیا جانے لگے! جیسا کہ بعض حضرات اپنے جوشِ عقیدت میں کر گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح کی ایک بڑی اہم آیت سورۂ قمر کی پہلی آیت ہے: **اقتربت الساعة وانشق القمر**۔ (ساعتِ موعود قریب آ گئی اور چاند شق ہوگیا۔)

اور یہ سیرتِ نبویؐ میں بے شک ایک معلوم و معروف واقعہ ہے، لیکن یہ کیا غضب ہے، جتنی بھی روایتیں دورِ مکی کے پانچویں سال کے اس واقعہ سے متعلق وارد ہوئی ہیں، سب کو بلا تکلف اس آیت کی تفسیر میں نقل کر دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com